OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 www.arjish.com ISSN (PRINT): 2707-1200
DOI: https://doi.org/10.53575/u8.v6.01(22)58-79

کلامِ فیض وراشد میں رجاعی عناصر: تجزیاتی مطالعہ

An Optimistic elements in the poetry of Faiz and Rashid: Critical Analysis

Muhammad Shahbaz Akmal
M.Phil scholar Urdu, AIOU, Islamabad.
Email: shahbazakmal33@gmail.com

Dr. Rashida Qazi
Associate Professor Urdu, Ghazi University, D.G Khan.
Email: rashida_qazi@yahoo.com

Dr. Mamuna Subhani
AP, Urdu, GCU, Faisalabad.
Email: mamunasubhani@gmail.com

Received on: 09-01-2022 Accepted on: 11-02-2022

Abstract

Keeping in view the optimistic elements, if we analyse the poetic work of Faiz Ahmad Faiz and Noon Meem Rashid. We see the difference in the narrative of optimism owing to different way of thinking. But the fundamental ideology of loving the life, prosperity, hoping for good moments to come even if they are full of struggle and toiling or be it the trust on ups and downs of time or to remain pegged to awakening of some sentiment, the importance of life and living in a different way is equal found in both poets, Romanticism is crystal clear in Faiz's work whereas just as the intensity of realization, extreme optimism is also integral to Rashid's work.

Keywords: Faiz, Rashid, Poetry, Optimistic, elements, Study, etc.

رجائیت کیا ہے؟

انسانی جذبات کے ایسے مثبت رویے کو جو انسانی ذہن کو آرزو مندی، بلند حوصلگی اور بہتر کی جستجو کی طرف مائل کرے اور زندگی کو خوبصورت بنا کر پیش کرے، رجائیت کہلاتا ہے۔

رجائیت کے لیے فرہنگِ اصطلاحات میں انگریزی لفظ (Optimism)[۱] مستعمل ہے۔ نصیر ترابی شعریات میں رجائیت کا معنی "روشن پہلو" لکھتے ہیں۔[۲] صاحبِ جامع اللغات نے رجائیت کو عربی لفظ رَجا سے مشتق لکھا ہے، بمعنی امید، آس، دعا، منت۔[۳] اسی طرح صاحبِ فرہنگِ تلفظ نے "رجاء" بمعنی امید، آس، اچھی توقع رکھنا لکھا ہے جبکہ اس کی صفت رجائی قرار دی ہے۔[۴] رجائیت ایک ادبی اور تنقیدی اصطلاح ہے جو کسی شاعر یا ادیب کی زندگی سے جڑے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

"رجا عربی زبان میں امید کو کہتے ہیں۔ادبی اصطلاح کے طور پر آرزومندی،زندگی سے محبت اور پر امید لہجہ اختیار کرنا رجائیت کہلاتا ہے۔ شاعری میں خاص طور پر ایسے موضوعات اختیار کرنا جن سے عزم، حوصلہ اور امید کے جذبات پیدا ہوں، رجائیت ہے۔ رجائیت قنوطیت کی ضد ہے۔اگر قنوطی دنیا کے متعلقات، واقعات، رشتوں اور علائق سے مایوس ہوتا ہے، تو رجائی شخص حیات سے متعلق پُرامید رہتا ہے اور ہر شے کے بارے میں خوش گمانی رکھتا ہے۔"۵

دراصل رجائیت قنوطیت کی ضد ہے۔رجائیت کے نقطہء نظر کے مطابق یہ دنیا مجموعی طور پر خیر اور مسرت پر مشتمل ہے۔ان دونوں اصطلاحوں کی درمیانی کڑی "میلارازم"(Melorism) ہے۔جس کی رو سے اپنی تمام تر خرابیوں اور شر کے باوجود دنیا اور زندگی ترقی کر رہی ہیں اور خیر کی منزل کی طرف گامزن ہیں۔

رجائیت کی توضیح کے لیے چند نکات پیش ہیں:-

☆ رجائیت کے نظریے کی رو سے یہ دنیا تمام امکانی دنیاؤں سے خوش گوار ہے۔اگر کوئی اور دنیا ہوتی تو وہ اس سے زیادہ خوش کن نہ ہو پاتی۔

☆ رجائیت ایک خوش قیاس اور پر امید انسان کا نظریہ ہے۔جس کے نزدیک اس دنیا میں بہتر سے بہتر اشیا اور ماحول موجود ہے جو تھوڑی سی تگ و دو اور ڈٹے رہنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆ رجائیت یک ایسا نظریہ حیات ہے جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ دنیا مطلق خوشی، یک سر انبساط اور آزادی ہے۔

☆ جرمن فلسفی (لائبنز) کا نظریہ استحسان کہ اچھی سے اچھی دنیا پیدا کی جاسکتی تھی۔وہ ہماری دنیا ہے۔

☆ رجائیت: یہ عقیدہ کہ دنیا میں نیکی بدی پر غالب آجائے گی۔

☆ رجائیت: امید پروری، امید پرستی، خوشی امیدی، طبیعت کا یہ رجحان کہ ہر معاملے کا انجام اچھا ہوگا۔

رجائیت کو سماجی رویوں اور نفسیاتی اقدار کے زیرِ اثر تقسیم کیا جاسکتا ہے، خیالی اور فعالؔ رجائیت جس میں عمل اور عمل کرنے کے اظہار کی قوت موجود ہو یا صرف خیالوں میں بہتری کی امید قائم رکھنا، یہ تمام پہلو رجائیت کے مضامین کی تفہیم کرتے ہے۔

''رجائیت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک مجہول سی رجائیت جس میں عمل کی بجائے حالات کی کسی مساعد کروٹ کا انتظار ہوتا ہے۔دوسری وہ فعال رجایئت جو بہتر مستقبل کو وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہوتی ہے اور ضمنی ناکامیوں کے باوجود اپنی کامیابی پر یقین رکھتی ہے''6

ادب، فلسفہ اور فن کی تاریخ گواہ ہے کہ انسانی شعور نے ہمیشہ، ہر عہد میں فکر و نظر کے چراغ روشن رکھے ہیں۔ان چراغوں سے ہماری راہیں اور ہمارے سینے منور ہوتے رہے ہیں۔وقت کی رویں تیز ہوتی رہیں اور بنی نوع حالات کی آندھیوں میں ان چراغوں کی روشنی کبھی مدھم نہیں ہوئی بلکہ ان کی لویں انسان کی ہر نسل کے ان چراغوں سے روشنی، عزم و حوصلہ اور وجدانی بصیرت حاصل کرتی رہی۔انسان آرزوؤں کا پیکر ہے جو وقت کے جبر اور حالات کی ستم ظریفی کے باوجود اپنی انا کا نگراں اور محافظ ہے اور اپنی آزادی کو مقدم جانتا ہے اور فکری طور پر فعال اور سر

گرم سفر نظر آتا ہے۔اس طرح زندگی کا ایک حقیقی تصور سامنے آتا ہے جو اس کے شوق، تمنا اور آرزو کا مظہر ہے۔اور یہی آرزومندی رجائیت پسند شعرا کے تصور انسان میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔رومین رولاں کے مطابق بڑے فن کار وہ بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنی ترجمانی کرتے ہیں لیکن سب سے بڑے وہ ہیں جن کے دل سب انسانوں کے لیے دھڑکتے ہیں۔رجائیت پسند شعرا کے دل عوام کے لیے دھڑکتے ہیں ،وہ انسانیت اور اس سے جڑی ہر خوبصورتی کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔

فیض ان شاعروں میں سے ہیں، جنھوں نے ماضی کی روایت کو بھی اپنایا ہے اور نئے تجربات کو بھی ضروری سمجھا ہے ماضی اور حال کے امتزاج نے ان کے لب ولہجے میں انفرادیت پیدا کی ہے۔ فیض کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو تشبیہات اور اور استعارات کی کارفرمائی بھی ہے اور ان سے پیدا ہونے والی علامتوں کا اظہار بھی۔انھوں نے علامتوں کو اس طرح ملا یا دیا ہے کہ اشاریات اور ان میں فرق کرنا بہت مشکل ہے، یہ بات کرنے کا مقصود یہاں یہ ہے کہ اشاریہ میں جو ردِ عمل ہوتا ہے علامت میں ذہن اس کو بہت سے معنوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔اشاریہ انسانوں کا ایسا تجربہ ہے جس کا نتیجہ عام طور سے ایک ہوتا ہے مگر علامت کا نتیجہ انسانی افتادِ مزاج کے اوپر منحصر ہے دونوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کہ کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے کی مملکت میں داخل ہو جاتے ہیں اور دونوں اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔

فیض پر تنقیدی مضامین تو بہت سے لکھے گئے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ذہن کا نفسیاتی طور پر مطالعہ کیا جائے ان کے ذہن پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو فیض کے ذہن میں رجائیت کے مطالعے کے لیے ان کی نظم "دو عشق" کے پہلے حصے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔یہ نظم فیض کی کامیاب نظموں میں ہے ،اور اس میں علامت اور اشاریاتی انداز فکر میں دونوں کو بڑی حد تک ملا دیا ہے:

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقئ گلفام
وہ عکسِ رخِ یار سے مہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

اس نظم کا پہلا بند بعد میں آنے والے ہر بند سے مختلف ہے۔اس لیے کہ اس میں پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع (گلفام،ایام اور ہنگام) ہم قافیہ ہیں ،یہ صورت کسی اور بند میں نہیں ملتی،اس لیے کہ بعد میں ہر بند میں صرف دوسرے اور چوتھے اور مصرع کے ہم قافیہ ہونے کا التزام کیا گیا ،اس بند میں بظاہر ساقئ گلفام اور یار دو مختلف شخصیتیں ہیں۔اول الذکر موجود ہے اور نظم میں شاعر کا خطاب اسی سے ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ ساقئ گلفام ایک علامت بن کر ابھرا ہو جب کہ آخر الذکر (یار) سے جو تعلقات تھے وہ اب ماضی کی ایک داستان بن چکے ہیں اس سے ذہن صرف ایک سمت جا سکتا ہے، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعے میں کامیاب عشق کی تین مختلف حیثیتیں بیان کی گئی ہیں۔

امید کے ہنگام کو دل کی دھڑکن سے کیوں تشبیہ دی اس کا سبب صرف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دونوں میں جہاں شور اور آواز مشترک ہے وہاں

دونوں میں نمو کا جذبہ بھی شامل ہے۔ کسی منظر کو دیکھ کر وہ واردات جن سے امید بیدار ہوتی ہے اور امید کے پیدا ہوتے ہی یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔ یہاں 'سی' اور 'سا' نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔ اگر وزن کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ کی جائے تو یہ کہنا شاید مفہوم کو زیادہ واضح کر دیتا ہے:

پھول کی طرح کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت

اور

دل کی طرح سے دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

اور آگے یوں کہتا ہے:

امید کے لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر
اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

یہ دونوں بند امید کے اس منظر کو پیش کر رہے ہیں جس کی یاد پر پہلے بند کی انتہا ہوئی ہے، قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلے بند میں دیدار کی ساعت کا بھی ذکر ہوا ہے اور امید کے ہنگام کا بھی، تاہم شاعر کا ذہن بجائے دیدار کی تفصیلات کے امید کی تفصیلات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ دیدار ایک خارجی حقیقت ہے جس کی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دلِ امیدوار کا سہارا ملے۔

پروفیسر ظہیر احمد اس نظم کے بارے رقمطراز ہیں:

"امید کی تدریجی کیفیت کا راز یہ ہے کہ پیشِ نظر سلسلے کی ہر کڑی کے سامنے آنے کے بعد اس سلسلے کے منقطع ہو جانے کا ڈر لگا رہتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ پہلی کڑی کے بعد دوسری کڑی سامنے آجاتی ہے اور دوسری کے بعد تیسری۔ اور سامنے آجانے والی ہر کڑی سابق سے زیادہ دل فریب ہوتی ہے۔ ان نظم کے پہلے دونوں بندوں کو دیکھنے سے امید کے تسلسل کا یہ دوسرا پہلو واضح ہوتا ہے، دوسرے بند کے چار مصرعوں میں امید کو غمِ شوقِ درد، اور نگاہوں کی واردات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان چاروں چیزوں کے باہمی ربط کی مختلف شکلیں ہیں، ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے 'درد' کی حرکاتِ سلبی (منفی) اور غمِ دل (مرادِ عشق) شوق اور نگاہوں کی ایجابی (مثبت) ہیں، ظاہر ہے کہ غمِ دل کے

نصیب جاگنے سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ دل کا نصیب جاگا یا عشق کا مقدر بیدار ہوا جس کی وجہ سے درد والم کی میعاد ختم ہوئی۔ شوق کی ترسی ہوئی شب کے آخر ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ ، شوق کو کامیابی ملی نیز نگاہوں کی مراد بر آئی۔ چناچہ درد کا انجام سلبی اور شوق کا ایجابی۔ ایک دوسرے اعتبار سے مذکورہ چاروں چیزوں میں تقابل نہیں بلکہ تسلسل ہے، امید کی پہلی حرکت ایک داخلی کیفیت ہے جس کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اب تک جو صدمے اٹھائے ہیں ان سے نجات کی راہ اس طرح نکلی ہے کہ اب زمین و آسماں کے روپ بدل گئے۔ امید کی تیسری حرکت اسبابِ غم کے مضمحل اور پسپا ہو جانے سے عبارت ہے، سب سے آخر میں امید کی حرکت ایسی کیفیت ہے کہ جس کے داخلی معنی بھی ہیں اور جو خارجی اشیا میں ایک نئے معنوی رنگ اور نکھار کو بھی لازم بنا دیتی ہے"7۔

فیضؔ نے دوسرے بند کے آخری مصرع میں ایک مرکزی تصور پیش کیا ہے جس کی جزئیات اگلے بند میں ملتی ہیں، دراصل اس صنعت گری کو شاعر کی اس تدبیر کے مقابل رکھا جا سکتا ہے کہ اس میں پہلے بند کو ہنگامِ امید کے اجمالی تذکرے کے ساتھ ختم کیا۔ اور اگلے بند میں اس اجمال کی تفصیل شروع کی ہے۔ تیسرے بند میں 'بام'، 'کنج'، 'در' اور 'راہ' کا ذکر ہے۔ ان کے باعث جو جھلکیاں نمودار ہوئی ہیں ان کو نور، رنگینی اور سیمابیت کے استعاروں میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بے صبر نگاہوں کے مقدر کا امید سے چمک اٹھنا ثابت ہو جائے۔

"عکسِ رخِ یار سے مہکے ہوئے ایام"، "دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام"، بہے گا تری رفتار کا سیماب"، فغاں بھول گئی ہے ترے رخسار کا خم" ایسی تراکیب ہیں جو مشتبہ ہیں۔ فیضؔ کے یہاں یہ علامتیں بہت واضح ہیں، یہ علامتیں شاعر کے مخصوص لب و لہجے کی بھی نمائندگی کرتی ہیں اور اس کے نظریات کی بھی، اور گرد و پیش میں جس ماحول سے دوچار ہے اس کا بھی اظہار بڑی خوبی سے ہوا ہے، رومان اور انقلاب کے اس خوبصورت سنگم پر زندگی کے حقائق اور رومان دونوں اپنی تمام آگہی کے ساتھ نمایاں ہیں۔

نصرت چودھری فیضؔ کی شاعری کے بارے رقم طراز ہے:

"دراصل ان کے دل میں زندگی کو سنوارنے اور خوب سے خوب تر بنانے کا بیکراں جذبہ موجود ہے اور یہی جذبہ انھیں مایوسی کا شکار ہونے سے بچاتا ہے۔ وہ کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی امید اور یقین سے دست بردار نہیں ہوتے۔ ان کے شعری شعور میں ابتدا ہی سے تاثر قبول کرنے کی غیر معمولی قوت موجود تھی، انھوں نے انفرادی ذہن کی آب و تاب کو کبھی کھونے نہیں دیا"8۔

"دستِ صبا" کی ایک نسبتاً طویل نظم "شورشِ بربط و نے" تمثیلی انداز میں دو آوازوں کی تکرار ہے۔ اس میں فکری تعطل، پیامِ حرکت اور عارضی قنوطیت کے ساتھ ساتھ رجائیت کی دلگیر کہکشاں موجود ہے جو ذہنی کش مکش اور فکری کشیدگی کی مظہر ہے۔ تشکیک اور تیقن کے بیچ امیدوں کی فضا ان اشعار سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے

وہ شورش کہ جن کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں
(شورشِ بربط و نے-دوسری آواز)

"دستِ صبا" نظموں کا مجموعہ "نقشِ فریادی" سے زیادہ مختصر ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل ہیں وہ نقشِ فریادی کی نظموں کے مقابلے میں صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے زیادہ اہم ہے کیونکہ ان سے فیض کی شاعری کے ایک نئے موڑ اور ان کی فکر کی ایک نئی منزل کا پتہ چلتا ہے، اس میں ایک نیا انداز ہے ایک نیا آہنگ ہے، اس کے موضوعات کچھ ایسے نئے نہیں ہیں لیکن حالات نے انھیں بڑی حد تک جدت سے ہمکنار ضرور کر دیا ہے ان موضوعات میں ایسی کچھ وسعت اور ہمہ گیری بھی نہیں ہے لیکن احساس کی شدت، جذبے کے خلوص اور عمل کی خواہش نے اس میں ایک وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر دی ہے

فیض ایک ایسے دور کی پیداوار ہیں جب حالات نے انھیں عمل کے میدان میں لا کھڑا کر دیا ہے، جب وہ مسائل کو صرف دیکھنے ہی کے قائل نہیں رہے ان سے دوچار بھی ہوئے ہیں اس صورتحال کے اثرات "دستِ صبا" کی نظموں میں صاف ظاہر ہیں ان میں ایک نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے، ایک جولانی نظر آتی ہے، زندگی کو سنوارنے کا ایک نیا جذبہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، حالات کو سدھارنے کی ایک نئی امنگ، ایک نیا آہنگ اور ایک نئے انداز کے ساتھ کارفرما معلوم ہوتی ہے۔ ان نظموں میں قنوطیت نہیں ہے بلکہ ایک رجائیت ہے ان میں زندگی سے بیزاری نہیں ہے۔ ان کو نئے نظام سے آشنا کرنے کی تمنا ہے۔ ان میں ناسازگار حالات پر خون کے آنسو ضرور ہیں لیکن ان حالات کو سازگار بنانے کی آرزو بھی بہت نمایاں ہے۔ ان میں جذبے کی شدت اور نقطہء نظر کے خلوص کے ساتھ عمل کی خواہش بھی نظر آتی ہے۔ یہ نظمیں کسی صورت محدود نہیں ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ ان میں نئی زندگی کی تمنا اور نئے نظام کی آرزو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، ان کے علاوہ بھی ان میں بہت کچھ ہے، ان میں حسن بھی ہے، عشق بھی ہے، وقتی اور لمحاتی کیفیات کی ترجمانی بھی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"ان میں حالات کو بدلنے کی فکر ہے، نئے حالات کو وجود میں لانے کی تمنا ہے، نئے ماحول کے پیدا کرنے کا یقین محکم ہے، یہی سبب ہے کہ یہ نظمیں ایک رجائی رجحان کی آئینہ دار ہیں۔ فیض کی نظموں میں رجائی رجحان اس سے قبل اس طرح اس سے پہلے موجود نہیں تھا۔ پہلے تو ان میں ایک میٹھا میٹھا سا درد تھا، ایک ہلکا ہلکا سا سوز تھا اور اس کی وجہ سے ایک سوگواری فضا ان کی ساری شاعری پر محیط تھی۔ اب ان کے یہاں سوز اور درد تو ہے لیکن یہ سوز اور درد ناکامی اور مایوسی کا سوز نہیں ہے اب تو ان میں انسانیت کی زبوں حالی کا سوز اور درد ہے، ایک ناقص نظام کی پیدا کی ہوئی پریشاں حالی کا سوز و درد ہے۔ یہ خصوصیت فیض کی شاعری کے ایک نئے رجحان کی آئینہ دار ہے"[9]

فیض نے "اے دلِ بے تاب ٹھہر" میں ماحول کی بدلتی ہوئی کیفیت کو اگرچہ اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن اس کے علامتی انداز نے اس

میں خاصی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی ہے۔اس نظم میں انھوں نے ایک ناقص نظام کی تیرگی کو امنڈتے ہوئے دیکھا ہے۔شب کی رگ رگ سے انھیں لہو پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے، نبضِ ہستی کی رفتار سے انھوں نے دونوں عالم کے نشے کو ٹوٹتا ہوا محسوس کیا ہے لیکن وہ اس تیرگی کے بڑھنے اور رات کے گرم ہو کے بہنے کو ضروری سمجھتا ہے کیونکہ یہ تاریکی ہی تو سحر کو پیدا کرتی ہے، یہی تو غازہء رخسارِ سحر بنتا ہے، اس لیے وہ دل کو تسلی دیتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ حالات کے تیور سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اب سحر کے بے نقاب ہونے میں کوئی دیر نہیں، اب صبح ہونے والی ہے جو چیز اس کو روکے ہوئے ہے وہ لغزشِ پا کی پابندئ آداب ہے، جب یہ پابندئ آداب اٹھ جائے گی اور ایک والہانہ انداز پیدا ہو جائے گا تو نگارِ سحر بے نقاب ہو گی۔ فیض زندگی کے آلام و مصائب سے فرار حاصل کرتے ہیں نہ بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں بلکہ اپنی مثبت اور تعمیری سوچ سے زندگی کے اس زہر کو امرت میں بدل کر جینے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر!
ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندئ آداب ابھی
(اے دلِ بیتاب ٹھہر)

لیکن اس صورت حال کا بہت جلد بدل جانا یقینی ہے کیونکہ حالات بدل رہے ہیں اور ان حالات کی تبدیلی میں شعوری کوشش سے شدت پیدا ہونے کے امکانات ہیں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب دیوانے صحیح معنوں میں میخانے بن جاتے ہیں تو

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گراں باریٔ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہے چھنکتی ہی رہے
(اے دلِ بیتاب ٹھہر)

فیض نے رجائیت کو صرف حال تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ایک مستقبل گیر اکائی کی صورت میں وسعت سے ہمکنار بھی کیا ہے۔ فیض کو

زندگی کے تسلسل پر یقین ہے، اسی لیے اس کو اس خیال سے کہ ممکن ہے اپنی جدوجہد کا پھل وہ خود نہ کھا سکے کوئی ملال نہیں ہوتا—ہم نہیں تو ہمارے بعد آنے والے لطفِ حیات سے بہرہ ور ہوں گے۔ "سرِ مقتل" کے آخری تین مصرعے مستقبل کے کینوس پر تصویرِ امید بناتے نظر آتے ہیں۔

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں ہے پنہاں اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

(سرِ مقتل)

شاید قریب پہنچی صبحِ وصالِ ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں
ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں پر
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر و باراں
آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

فیض نے "صبح"، "کرن"، "اجالا"، "بہار"، "نور" اور اس طرح کے دیگر الفاظ بطور استعارہ استعمال کیے ہیں جو بہتری اور خوشحالی کے لیے مثبت امیدوں اور امنگوں سے منسلک ہیں۔ زندگی کی ہنگامہ آرائی میں تمنا و توقع کو باقی رکھنے کی ایک کوشش یہ بھی ہے:

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
بے خبر گزری، پریشانیٔ امید لیے

(قیدِ تنہائی)

انسانی زندگی کی چند قدریں جو انسان کو بہت عزیز ہیں کیوں کہ یہی قدریں زندگی کے گرد حفاظت کا حصار قائم رکھتی ہیں اور انھیں محفوظ رکھنا خود زندگی کے تحفظ، بقا، بہتری اور آرائش کے لیے ضروری ہے۔ محبت، انصاف، امن و آزادی، راستی، حسن و صداقت وہ حیات افزا اثباتی قدریں ہیں جن کی سربلندی کے لیے فیض کی نظمیں وقف ہیں۔ فیض نے ایران کے ان طلبا کی جدوجہد برائے امن و آزادی کو اپنی نظم "ایرانی طلبا کے نام" کی بدولت غیر فانی بنا دیا۔ اس نظم میں زندگی کے حضور میں جس قدر عظمت و احترام، جتنے تقدس و اخلاص کے ساتھ خراجِ

عقیدت پیش کیا ہے اور جو روحانی تڑپ اجاگر کی ہے وہ فیض ؔ کے نظریۂ حیات سے کلیتہً ہم آہنگ ہے۔

فیض ؔ کے خیال میں انسانیت کے خلاف ایک سازش ہے جو انقلاب اور عوامی جدوجہد کی راہوں میں روڑے اٹکاتی ہے لیکن ظاہر ہے تغیر کا عمل جو جدلیاتی کش مکش میں جاری رہتا ہے اس کو روکا نہیں جاسکتا وہ زندگی کا قانون ہے اس کی وضاحت اس نظم میں نہیں ہے لیکن اس نظم کا پورا پیٹرن اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فیض کے پیشِ نظر یہ خیال ضرور رہا ہے کہ ضرور رہا ہے کہ نظم میں چونکہ اتنی تفصیل اور وضاحت کی گنجائش نہیں ہے اس لیے اس کی علامتوں اور اشاروں کے مجموعی تاثر سے یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی ہے اس نظم کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔

طبقاتی سماج افراد کی ذہنیتوں کو بڑی حد تک مسخ کر دیتا ہے۔ زندگی کے حقائق کا احساس ان میں باقی نہیں رہتا۔ ان کی قدریں بدل جاتی ہیں ،نقطہ ء نظر اور نظریہ ءحیات غلط بنیادوں پر قائم ہو جاتا ہے۔ زندگی پھولوں کی سیج سے عبارت سمجھ لی جاتی ہے، کوہ کنی کا خیال بھی باقی نہیں رہتا اس لیے گوہر مراد حاصل کرنے کے لیے اس کا خیال آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح زندگی ایک فرار کا نام بن جاتی ہے۔ یہ نظام طبقاتی سماج میں بہت عام ہوتا ہے۔ فیض نے یہ حقیقت شدت کے ساتھ محسوس کی ہے وہ اس کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔ "مرے ہمدم مرے دوست" میں انھوں نے اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، جب وہ یہ کہتے ہین کہ سرف حرفِ تسلی سے اجڑے ہوئے بے نور دماغ کا جی اٹھنا، پیشانی سے تذلیل کے داغ کا دھل جانا اور بیمار جوانی کو شفا مل جانا مشکل ہے تو گویا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہر فرد کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔، زندگی کو نکھارنے کے لیے اس کو ارتقا سے ہمکنار کرنے کے لیے زندگی کی جدلیاتی رفتار مین عمل سے شدت شدت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر افراد کی الجھنون کا مداوا تو صرف عمل کا نشتر ہے اور وہ صرف افراد کے پاس ہے ان لوگون کے پاس نہیں جو ایک غلط سماجی نظام میں زندگی اور عمل سے دل برداشتہ ہو کر تخیل اور رومان کی سہانی دنیائیں بسانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ فیض نے ان خیالات کو کتنے دلکش پیرایہ میں ڈھال کر پیش کیا ہے ؎

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست
روز و شب شام و سحر میں تجھے بہلاتا ہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے مہتاب کے سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس لیے عارض محبوب کا شفاف بلور
یک بہ یک بادہءاحمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں گاتا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں

فیضؔ نے ایک بری معرکتہ الآرا نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" لکھی ہے۔اس نظم میں زندگی اور اس کی کش مکش ماحول اور اس کی طبقاتی آویزش کا نقشہ بری خوبی سے کھینچا ہے۔فرسودہ نظام اور اس کی کارفرمائیوں پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں۔انسان کی زبوں حالی اور بے بسی کا ماتم منایا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے بنیادی حقائق کا بھی احساس دلایا ہے۔فیضؔ کے خیال میں اس کا ختم ہونا یقینی ہے۔اس کی موت کو اب کوئی نہیں روک سکتا، کیونکہ خود زندگی نے حقائق کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے تو

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں
کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں ہر جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

اسیری کے دوران ان کی دوسری تحریر ان کی شاعری کا مجموعہ "زنداں نامہ" ہے اسیری کے دوران جو کچھ فیض نے لکھا ان میں سب سے نمایاں پہلو فیض کی رجائیت ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ "رجائیت" اور "اطمینانیت" فیض کی زندگی اور کلام کے دو بڑے عناصرِ ترکیبی ہیں ،اسیری یا زندانی انسان کی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جہاں بڑے بڑے لوگوں کا پتّہ پانی ہو جاتا ہے لیکن فیض اپنے مخاطبین کو زندگی کے مثبت پہلوؤں اور تابناکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ کسی بھی آدرش کے مسافر کی یہ ریت تاریخ میں ہر جگہ رقم ہے کہ وہ اس آدرش کے حصول کے لیے پر امید ہوتا ہے اور وہ حصول کے اس ولولے کا اسیر ہوتا ہے جو ایک نادیدہ طاقت کی طرح بجانبِ منزل اسے کشاں کشاں لیے چلتا ہے۔ ہیگل اسے تاریخ ساز شخصیتون کے کردار کا اہم حصہ سمجھتا ہے لیکن اس امید کی بنیاد پر سیاسی کارکن اور تخلیق کار رجائیت کا محل کھڑا کرتا ہے جو اس کے رگ وپے میں سمایا ہوتا ہے۔

اشفاق سلیم مرزا لکھتے ہیں:

"سیاق وسباق سے کٹی ہوئی معروضی حالات سے بے خبر 'رجائیت' بھی ایک تجرید بن کر رہ جاتی ہے، وہ حد سے بڑھی ہوئی رجائیت ایک افیون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور لوگ رجائیت کی سرشاری میں ایسے گم ہوتے ہیں کہ آس پاس اور معروض سے کٹ جاتے ہیں وہ کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس دن کے انتظار میں رہتے ہیں جب منزل خود آکر ان سے معانقہ کر لے گی، جیسا کے برصغیر کے ترقی پسند ایک عرصے تک اسی سرشاری میں رہے کہ

وہ صبح کبھی تو آئے گی
جب امبر جھوم کے ناچے گا
اور دھرتی نغمے گائے گی

کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اس تجریدی قسم کی رجائیت اور ماورائے ارضِ دنیا کے حسین خواب دیکھنے میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ کہ ترقی پسند اس دنیا کو گل وگلزار بنانے کی سوچتے ہیں جب کہ ماورائے ارض کے مسافر چند سیکنڈوں میں پہلے سے بنائی ہوئی جنت کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں"10

الم نصیبو، جگر فگارو
کی صبح افلاک پر نہیں ہیں

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پر غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں یہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
اور پھر آدرش کو پا لینے کا عزمِ صمیم تر
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیض نے اپنی تحریروں میں رجائیت ہی کو مرکزِ خیال بنایا اور بظاہر اپنی زندگی سے مطمئن نظر آئے لیکن جہاں کہیں وہ اس ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو ان میں کہیں کہیں افسردگی، بددلی اور خود ترحمی کے احساسات سوالیہ نشان بن کر سامنے آجاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تو ایک نظم میں کہتے ہیں کہ

کچھ اتنے ڈھیر پرانے تھے
ویدان کی ٹوہ کو پا نہ سکے
اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے؟
(تم ہی کہو کیا کرنا)

فیض صاحب کے ہاں رجائیت اور جہد مسلسل کا ایسا تال میل ہے جو کہیں بھی ڈھیلا نہیں پڑتا بلکہ ہر نئے خط اور نظم ایک نئے جوش اور ولولے اور عزم کے ساتھ سامنے آتا ہے اور زندگی کے چند سالوں کے کچھ وقفوں کے علاوہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔

آخر تو ایک روز کرے گی نظرِ وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

ہمارے یہاں انسانی و ملکی تاریخ کچھ ایسے رخ پر جا رہی ہے جہاں فیض جیسا رجائیت پسند یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں ہیں آسمان کے آنسو
شمعیں بے نور ہو گئی ہیں
آئینے چور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بج کے کھو گئی ہیں
اور ان بادلوں کے پیچھے
دور اس رات کا دلارا
درد کا ستارا
ٹمٹمار ہا ہے
جھنجھنا رہا ہے
مسکرا رہا ہے

پاکستان کے بنتے ہی برطانوی سامراج کی جگہ امریکی سامراج اس خطہء زمین کو کنٹرول کر رہا تھا۔ عوام کو غلام رکھنے کے لیے کچھ نہ ہو رہا تھا مگر شاعر۔۔۔ خواب دیکھنے والا شاعر اپنے ارادے پکے کرتا ہے۔ ظلم و ناانصافی کے خلاف اپنا مورچہ یعنی اہلِ قلم کا مورچہ ایک بار پھر سوال اٹھاتا ہے۔ تم کس کے ساتھ ہو؟ ایک طرف وہ ہیں جنھیں ان کے حق سے محروم کیا گیا۔ دوسری طرف وہ جنھوں نے محرومی کو عوام کا مقدر بنایا اور بندوق کے زور پر خلق کے خدا بن بیٹھے۔ تب ہی فیض نے اعلان کیا:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ویرانئ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیءایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداواے یٔ الم کرتے رہیں گے

سلیم اختر لکھتے ہیں ؛

"فیض احمد فیض کی یہ آواز بری دور تک پہنچی اور اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی دیکھیں تو وہ راہیں جن پر شاعرِ انقلاب اپنے خوابوں کی شمعیں جلا کے چلا تھا کہیں بھی سونی دکھائی نہیں دیتیں۔ فیض کو پڑھتے ہوئے یہ لگتا ہے کہ شاعرِ انقلاب کے ہاں ذوقِ یقین کے موسم لا محدود اور لا زوال ہوتے ہین اور یہ خیالِ عظیم کہ آج نہین تو کل زندگی بدل جائے گی اور بہتر کے لیے۔ نئ نسلوں کی نامراد زندگی کی مرادیں کئ نسلوں کے خواب دیکھنے والوں کی آنکھیں کھاد بن کر مٹی مین مل جائیں گی تو یہ مٹی جی اٹھے گی۔ یہ بھی ایک فارمولا ہے سماج کی سائنس کا۔ایک تسلی بھی ہے ؛

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم" 11؎

امید اور نوید کا پیغام بر، عشق اور انقلاب کا شاعر وطن کی جگہوں پر نثار ہوتا ہے اور یقینِ محکم کا چراغ تو تیز آندھیوں کے آگے بھی جلائے رکھتا ہے۔ یہی تو اس کی کرامت بھی ہے، مہر و محبت بھی اور اس کی شاعری کا وعدہ بھی،اور کون ہے جس کی شاعری وعدہ کرتی ہے

اہلِ قفس کی صبحِ چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے عہد اور پیماں ہوئے تو ہیں

راشد کی شاعری ہندوستان مین سیاسی آزادی کی جدوجہد اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران پروان چڑھی۔ وہ زندگی کے ایک نئے زاویہء نظر کے ساتھ شاعری میں داخل ہوئے۔ یہ زاویہء نظر ایک ایسے معاشرے کی آرزومندی سے عبارت ہے کہ جس میں فرد مکمل طور پر آزاد ہو۔ شعری تجربے میں یاسیت کا ظہور، شاعر کے فکر و خیال اور عمل کی بے بسی کے نتیجے کے طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ یاسیت تو احساسِ شکست کی ایک شکل ہے ۔یہ اس بات کی مظہر ہے کہ خارجی اور داخلی صورت حال کے بحران کو عزائم اور خواہشات کے مطابق حل کرنا ممکن نہیں رہا۔خواہشات کی پژمردگی اور جذبات کی شکست ایک نئ صورت حال پیدا کرتی ہے ۔شاعر عوامل اور محرکات کو جس نہج پر چلانا چاہتا تھا وہ ممکن نظر نہیں آتا،اس کے سامنے ایک ایک کر کے عمل اور فکر کے راستے مسدود ہوتے جاتے ہیں۔زندگی کے ساتھ اس نے جو روشن امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ بھی پوری نہیں ہونے پاتی ہیں اور اس سارے عمل میں شاعر کی اپنی بے بسی اور بے چارگی بہت پریشان کن ہو جاتی ہے۔ لہذا اب وہ کسی ایسے نئے اور بامعنی امیج کی تلاش میں نکلتا ہے جو اسے اس بحرانی لمحے کی شدت سے نجات دلائے اور وہ یک گونہ

سکون محسوس کرتا ہے۔ چناچہ فوری طور پر اس کے سامنے سکون کا جو امیج نمودار ہوتا ہے وہ اس لمحے کی صورت حال کے اظہار کا ہے اور اظہار کی یہ صورت ہی یاسیت ہے، یاسیت کے اظہار سے کم از کم وہ سمجھتا ہے کہ میں نے تخلیقی طور پر اس لمحے کے تخلیقی کرب کو محسوس کر لیا ہے۔

راشد کے کے نزدیک زندگی ساکت امیج کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک متحرک امیج ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل میں ہم مختلف تجربات حاسل کرتے ہین، لہذا یاس، بے معنویت اور رجائیت زندگی کے مختلف سلسلوں کے نام ہیں۔ یہ مختلف اوقات کے مختلف سلسلوں کے نام ہیں، یہ مختلف اوقات کے مختلف احساسات کا نام ہے، اور یہ سب کچھ نیچرل معلوم ہوتا ہے۔ یاسیت، بے معنویت اور رجائیت کے کے سب سے زیادہ تجربات لا=انسان کی نظموں میں موجود ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اسی مجموعے میں یہ موضوع زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر راشد تبسم کے نزدیک وہ نظمیں جن میں حیات وکائنات کے لیے ایک ایک رجائی رویہ ملتا ہے، یہ ہیں:

"دل مرے صحرا نوردِ پیر دل"، "میرے بھی ہیں کچھ خواب"، "بوئے آدم زاد""آرزو راہبہ ہے"، "زندگی سے ڈرتے ہو"، "بے مہری کے تابستانون میں"، "بوم کا سایہ"، "سمندروں کے وصال سے"، ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے "12۔

راشد اپنے خوابوں سے جو دنیا بناتا ہے وہ اس طلسمی دنیا سے بالکل مختلف ہے جس کا تصور سارتر نے دیا تھا، اس قسم کی طلسمی دنیا اختر شیرانی کی شاعری کی ہو سکتی ہے یا پھر "ماورا" کی ابتدائی رومانوی نظموں کی اور یہ ظاہر ہے کہ راشد کے اس دور کی شاعری سے قطع نظر "ماورا" کے آخری دور کی نظموں سے "گماں کا ممکن" تک کا ہے۔ راشدؔ کے یہ رجائی خواب رومانی خواب نہیں ہیں ان کی بنیاد ان کا معاشرتی حوالہ ہے۔ ان خوابوں کے قدم معاشرے کے وجود پر ہیں ہوا میں نہیں۔ "لا=انسان" کے مصاحبے میں سے راشدؔ کا ایک اقتباس وجو مرے دوسرے نکتے کی وضاحت کرتا ہوں:

"شاعر کسی ملک کا رہنے والا کیوں نہ ہو اواس کے ملک کے لوگوں کا جذبہ ءغالب کچھ ہی کیوں نہ ہو، شاعر اپنا ایک رؤیا بھی رکھتا ہے، صرف ان اشیا اور حالات کا رؤیا نہیں جو موجود ہوں بلکہ ان کا بھی جو موجود نہیں اور جنھیں موجود ہونا چاہیے۔ ایسا رؤیا قریبی قوی محیط کے ماورا ہو سکتا ہے۔ گو وہ رؤیا اس کی وسعت اور شدت کیسی ہی کیوں نہ ہو محض کسی عدم سے نمودار نہیں ہو سکتا۔ ہر رؤیا کے پاؤں کسی موجود اور فوری حقیقت پر استوار ہوتے ہیں "13۔

اس رجائیت کو ہم غیر حقیقی یا ماورائی نہیں کہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقی شکلوں کی ایک توسیعی شکل ہی کا نام ہے۔ اب راشدؔ کے رجائی خوابوں کا ماحصل کیا ہے؟ راشدؔ یہ کہتے ہیں کہ زندگی کو اگر اس کے اسالیب اور اس کی بنیادی اقدار مل جائیں تو اس سے زیادہ بامعنی شے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ چناچہ ان کے شعری جدوجہد کا خلاصہ یہی ہے کہ زندگی کو بامعنی بنایا جائے۔ اور انسان کو اس کا حقیقی مرتبہ دیا جائے کہ وہ اپنی سیاسی اور تہذیبی آزادی کے ساتھ اس کائنات میں اپنے دور کا فرض ادا کرے۔ راشدؔ کے یہاں جو نیا انسان تخلیق ہوتا ہے تو وہ انسان اس ہی کے شعری شعور کی تخلیق ہے۔ اور اس شعور کی بنیادی بات یہ ہے کہ بقول راشدؔ فرد کی کامل آزادی سے بیش بہا دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

راشد کے خوابوں سے ایک ایسی رجائیت پیدا ہوتی ہے جو کبھی کبھی شوق اور لازوال اور لازمان کیفیات پیدا کر دیتی ہے اور ہم خود اس انہماک

سے اس شعری تجربے کے تحرک میں شرکت کرنے لگ جاتے ہیں۔ شاید یہ ان کے بے پایاں یقین، خلوص اور عقیدے کی کشش ہے جو وہ انسان کے بارے مین رکھتے تھے۔ رجائیت کے ان تجربوں میں کسی وقت استغراق اور عرفان کی وہ لہریں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جن کا تجربہ اہلِ دل کی قدرت اور تصرف ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں جہان جہاں عرفان کی ایسی روشنی پھوٹتی ہے کہ ان کا تجربہ جگمگا اٹھتا ہے:

پریشان و غمگیں و تنہا
کہ ہم ایشیائی
جو صدیون سے ہیں خوابِ تمکیں کے رسیا

یہ کہتے رہے ہیں:

ہمارا لہو زمِ افرنگ کی مومیائی
ہمارے ہی دم سے جلالِ شہی، فرّہء کبریائی
پریشان و غمگیں و تنہا
کہ ہم تابہ کے اپنے اوہام کہنہ کے دلبند بن کر
یونہی عافیت کی پر اسرار لذت کے آغوش سے
زہرِ تقدیر پیتے رہیں گے
ابھی اور کے سال دریوزہ گر بن کے جیتے رہیں گے
اسی سوچ میں تھا کہ مجھ کو
طلسمِ ازل نے نئی صبح کے نور میں نیم وا
شرم آگیں دریچوں سے جھانکا
مگر اس طرح ایک چشمک میں جیسے
ہمالہ مین الوند کے سینہء آہنی سے
محبت کا اک بے کراں سیل بہنے لگا ہو
اس سیل میں سب ازل اور ابد مل گئے ہوں

(طلسمِ ازل)

جدید شاعری کے بارے راشد کا یہ رجائی تصور کہ "جب تک شاعر خواب نہ دیکھ سکے وہ خود کو یا اپنے پڑھنے والوں کو حقیقت کے بند و سلاسل

سے نجات نہیں دلا سکتا" ابتدائی نظموں میں انسان ہر چند کہ ایک کمزور مخلوق ہے لیکن اس سے راشد کی بنیادی تشویش کا پتہ چلتا ہے۔

الٰہی تری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی ایک داستاں ہے ناتوانی کی
(انسان)

اس نظم میں راشد کی نظر معاشرے کے نچلے طبقے پر پڑتی ہے۔ انھیں سماج میں انسانی نابرابری کا شدید احساس ہے، راشد اس ناہموار صورتحال کے اسباب اور علاج کی تلاش میں نکلتے ہیں

کاش بتلادے کوئی
مجھ کو بھی اس وادیٔ پنہاں کی راہ
مجھ کو ہے اب تک تلاش
زندگی کے تازہ جولاں گاہ کی
کیسی بیزاری سی ہے
زندگی کے کہنہ آہنگِ مسلسل سے مجھے
سرزمینِ زیست کے افسردہ محفل میں مجھے
(وادیٔ پنہاں)

ایک اور نظم میں تمثیلی انداز میں "راہبہ" کو آرزو کا استعارہ بناتے ہیں:

آرزو راہبہ ہے بے کس بے نوا و حزیں
آرزو راہبہ ہے، عمر گزاری جس نے
ان ہی محرومِ ازل راہبوں، معبد کے نگہبانوں میں
ان مہ و سال یک آہنگ کے ایوانوں میں
(آرزو راہبہ ہے)

راشد نے نظم میں راہبہ کی دلی آرزو کی عکاسی کی ہے، راہبون کی بے حسی خوف کا منظر پیش کیا ہے۔ لیکن ان تمام مصائب اور نا ختم ہونے

والے مسائل کے درمیان بھی راشد نے راہبہ کی آرزو کے ذریعے ایشیا کے لوگوں کی آرزو کو بیان کیا ہے۔ "ایران میں اجنبی "تک راشد کے یہ رجائی خواب بالعموم ایشیا کے حوالے سے آتے ہیں لیکن "لا=انسان" سے ان خوابوں کا دائرہ آفاقی ہو جاتا ہے اب وہ دنیا کے سب محکوم اور محروم خطوں اور ان کے انسانوں کے بارے سوچتا ہے۔ ان کا محبوب اور بنیادی موضوع انسان ہے وہ اس کائنات مین اس کے بلند تر مقام کے بارے میں ہمیشہ سوچتے رہے۔

اے عشق ازل گیر وابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب ہیں، آزادیء کامل کے نئے خواب
ہر سعیء جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلا جل کے نئے خواب
اس خواب کی سطوت کے کی منازل کے نئے کواب
یا سینہء گیتی میں نئے دل کے نئے خواب
اے عشقِ ازل گیر وابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب

(میرے بھی ہیں کچھ خواب)

ایک اور مثال پیش ہے:

شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایا تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
اژدحامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے

آدمی ہنسے دیکھو

شہر پھر بسے دیکھو

راشد کی شاعری میں ملنے والی یہ رجائیت اور اس کے خواب در حقیقت ان کے فن کی بہت بڑی طاقت تھے۔ جس نے بطور شاعر ان کو توانا اور حوصلہ مند رکھا۔ اور ان کی شعری بصیرت میں ہمیشہ توسیع کا باعث بنی۔ اگر ان موضوعات کو ان کی شاعری سے الگ کر دیں تو یوں معلوم ہو گا کہ جیسے اس شاعری بصیرت کمزور پڑ گئی ہے۔ جہاں جہان اور جب جب ان کے شعری تجربے کا تحرک اور اس کی ضو فشانی کم ہوئی تو یہی رجائیت اور اس کے تصورات ان کو از سرِ نو تخلیقی حرارت سے توانائی بخشتے رہے۔ "لا=انسان" کی شعری توانائی کا بڑا سبب ان کا یہ رجائی قرینہ اور ان کے خواب تھے۔ یہ بات غور طلب بھی ہے اور دل چسپ بھی کہ "لا=انسان" میں ان رجائی خوابون کا زور و شور کیون برھ گیا اور وہ کون سے عوامل تھے جو ان کی تخلیق کا سبب تھے۔

ڈاکتر فخر الحق نوری لکھتے ہیں:

""لا=انسان" کا زمانہ ان کی تخلیقی زندگی کا سب سے زرخیز اور تاب ناک تھا۔ جہاں ان کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ فکر اور خیال کی گہرائی اور اس کی ندرت قدم قدم پر متاثر کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ ایک جہانِ نو ہے ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور وہ نہایت ہی مشاقی سے اس جہان کے ساتھ مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ چناچہ خواب اس جہانِ نو کا سرمایہ ہیں۔ اس جہانِ نو میں انھوں نے نئے انسان کے مقام کے بارے میں سوچا اور پھر ایک آدرشی سطح پر کھڑے ہو کر اس کے لیے آدرشی اور انبساط کے گیت گانے لگے۔ یہ گیت ہی ان کا توشہء آخرت تھے اور شعری سرمایہ بھی کہ یہ متاعِ بے بہا ان کے ہم عصر شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی "14۔

ڈاکٹر وزیر آغا راشد کی بغاوت کو رجائیت سے منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"راشد کی یہ بغاوت محض محبت کے افلاطونی تصور یا سوسائٹی کی بعض مروجہ اقدار کے خلاف ہی نہیں آخر میں تو یہ "زندگی" سے بگاوت اور سرکشی کا رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے چناچہ اپنی بعض نظموں میں راشد زندگی سے مفاہمت پیدا کرنے اور اس کے نشیب و فراز کو قبول کر کے ایک صحت مند فرار حاصل کرتا ہے یعنی قنوطیت سے مصنوعی رجائیت برآمد کرتا ہے "15۔

راشد کی ایک اور نظم "زنجیر" جو راشد کی رجائیت کو واضح کرتی ہے۔ راشد کی اس نظم مین ایک ایسے ملک کا نقشہ نہایت نفیس کنایوں اور استعاروں سے بیان کیا گیا ہے جو سالہا سال سے غلامی کی بے بسی اور مشقت مین زندگی بسر کر رہا ہو، نظم کے دوسرے اور تیسرے بند کا مفہوم نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن پہلا بند ذرا الجھن میں ڈالنے والا ہے، دوسرے بند مین پیلہء ریشم اور تیسرے بند میں اس ہنگام باد اور د کے معنی جلد ہی متعین ہو جاتے ہیں، یعنی پہلی تصویر حجلہء سیمیں میں مصروفِ مشقت پیلہء ریشم کی اور شاعر اس سے باہر نکلنے کو کہ رہا ہے کیونکہ ہر جگہ سینہء نخچیر مین اک نیا ارمان، ایک نئی امید پیدا ہونے کو ہے، یہ پہلی تسویر سمٹی ہوئی ہے اور دوسری تصویر پھیلی ہوئی، یعنی شاعر کی للکار کے اثر سے کوہساروں سے اس کی گونج پلٹ کر آرہی ہے گویا اس کی دعوتِ عمل کامیاب ثابت ہوئی ہے، لیکن ان دو تصویروں کے

تعین کی صورت میں درمیانی بند جواب پہلا بند ہے کچھ بے جا معلوم ہو گا، نیز عنوان "زنجیر" اور اس کے متعلقات حشو محسوس ہوں گے اس لیے اب ہم پھر نظم کی پہلی یعنی موجودہ صورت کی طرف آئیں تو پتہ چلتا ہے کہ شار کے ذہن میں ایک ملک کی غلامی کا تصور ہے، پابندی کا اور وہ ملک اسے ایک پابہ زنجیر ہستی معلوم ہوتا ہے ایک ایسی ہستی جس کی فعالیت محض اپنی غلامانہ مشقت، کولہو کے بیل کی سی کیفیت ہے، اس کے ذہن کو ریشم کے کیڑے کی طرف لے جاتی ہے، اور اس رغبت کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اس کے خیال میں اس غلام کی محنت اور مشقت کا تمام ثمرہ ایک دور کے ملک میں وہاں کی عورتوں کی آرائش اور زینت میں صرف ہوتا ہے۔ غالباً عورتوں کا دھیان آتے ہی حجلہء سیمیں، شبنم، مخمل، اور دیبا ایسے الفاظ اس کے ذہن میں آتے ہیں، غلام کا بنایا گیا سامان عورتوں کی ایب وزینت کے لیے بھیجا جاتا ہے، یہ خیال اس کے ذہن کو ریشم کے کیڑے کے ملک کی گزشتی تاریخ کا ایک تلخ واقعہ یاد دلاتا ہے، جب پیلہء ریشم کو دست بریدہ بنا دیا گیا تھا "بے دست و پا" ہو کر اسی نسبت سے ہے نیز اس نسبت سے بھی کہ پیلہء ریشم ہی اپنے حجلہء سیمیں کے اندر سمٹا سمٹایا ایک بے دست و پا ہیولی ہے۔

ہر جگہ پھر سینہء نخچیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
حجلہء سیمیں سے تو بھی پیلہء ریشم نکل
وہ حسین اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کے لیے
سال ہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم و زر
ان کے مردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال!
شکر ہے دنبالہء زنجیر مین
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگزاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلاموں! بھاگ جاؤ
پردہء شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلہء شبخوں بناؤ

(زنجیر)

ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

"انتقام" میں دورِ فرنگ کے ادنی غلام کی نفرت ایک منتقمانہ انتہا کو پہنچتی ہے "اجنبی عورت" میں دیوارِ ظلم اور دیوارِ فرنگ کا احساس گونجا ہے۔ "زنجیر" میں یہی احساس ظلم پروردہ غلامون کے لیے نعرہء بغاوت بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ فقط "ماورا" کی نظموں کا ذکر ہے، "ایران میں اجنبی" کی نظموں میں مشرق و مغرب کی آویزش کا احساس شدید تر اور تلخ تر ہو گیا ہے۔ یہاں راشد کی مشرقی رجائیت زیادہ ابھر آئی ہے"16۔

راشد کی ان نظموں میں ایک گہری سیاسی بصیرت بھی ملتی ہے اور انسانی مساوات کا مظاہرہ جو کسی فیشن یا وقتی نعرے کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ شاعر کے اپنے ادراک کی دین ہے، ان نظموں کی ایک نوع کی ہمہ گیری اور آفاقیت بھی ہے اور اس باب میں بھی راشد نے رجائیت کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

رجائی عناصر کو مد نظر رکھ کر کلامِ فیض احمد فیض اور ن م راشد کا جائزہ لیا جائے تو ان شعرا کا زاویہ نگاہ مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے رجائی بیانیہ میں بھی فرق نظر آتا ہے لیکن بنیادی نظریہ زندگی سے پیار کرنا، خوشحالی اور اچھے لمحات کے آنے کی امید خواہ وہ جدوجہد یا تگ ودو سے عبارت ہو یا وقت کے تغیر و تبدل پر توکل ہو، کسی جذبے کی بیداری سے پیوستہ ہو لیکن زندگی کی اہمیت اور اسے جینے کا اک انوکھا انداز اور طریقہ دونوں کے ہاں یکساں پایا جاتا ہے۔ فیض احمد فیض کی رجائیت میں ان کی رومانیت کا عکس واضح نظر آتا ہے جبکہ ن۔م راشد کے یہاں احساس اور فکر کی شدت کی طرح رجائی عوامل میں بھی شدت کا عنصر شامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، نفسیات اور تعلیم، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۸، ص ۲۲۶

۲۔ نصیر ترابی، شعریات، پیراماونٹ پبلشنگ انٹرپرائز، کراچی، طبع دوم، ۲۰۱۳، ص ۱۶۱

۳۔ خواجہ عبدالحمید، جامع اللغات، جلد دوم، اردو سائنس بورڈ، اپر مال، لاہور، ص ۱۱۱۷

۴۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد،، ص ۴۲۴

۵۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فانڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم، ۲۰۱۲، ص ۱۰۴

6۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸، ص ۱۲۲

7- ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، جدید شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1993، ص 118

8- نصرت چودھری، ڈاکٹر، "فیض کی شاعری-ایک مطالعہ"، شاردا پرنٹنگ پریس، جموں، جون 1985، ص 67

9- عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983، ص 273

10- اشفاق سلیم، مرزا، زندان اور فیض کا نظریہ حیات، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، جنوری تا مارچ 2002، ص 199

11- سلیم اختر، ڈاکٹر، فیض کا تصورِ ادب "میزان" کی روشنی میں، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، جنوری تا مارچ 2002، ص 93

12- تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، لا=راشد، بک پرنٹرز، ٹمپل روڈ، لاہور، 1994، ص 27

13- ن۔م۔راشد، حلقہ اربابِ ذوق اور زبان و ادب کے مسائل، مغنی تبسم، شہریار، مرتبین: راشد فکر و فن، مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد، 1971، ص 381

14- فخر الحق نوری، ڈاکٹر، مطالعہء راشد، مثال پبلشرز سینٹر پریس مارکیٹ، فیصل آباد، ستمبر 2010، ص 159

15- وزیر آغا، ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، 1974، ص 44

16- آفتاب احمد، ن۔م۔راشد ایک مطالعہ، مرتبہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، احمد برادرز، کراچی، 1986، ص 108

References

1- Dictionary of terminologies of philosophy,psychology and education, Traqqi urdu bureau, New dehli,1988,page 108

2-Naseer turabi, shairyat, paramount publishing inter prize ,Karachi,2nd edition, 2013,page 121

Khawja abdul hameed, jami ul lughat ,part II,urdu science board, upper mall,Lahore, page 1117

4-shaan ul haq haqqi,Farhang e talaffuz, Idara frogh e qoumi zaban,Islamabad, page 424

5- Anwer jamal, Adbi istlahaat, National book foundation, Islamabad, 3rd edition, 2012, page 104

6-Abul ijaz Hafeez siddiqui ,Kashaf e tanqeedi istlahat, Idara frogh e qoumi zaban,Islamabad, page 122

7- Prof.Zaheer Ahmad Siddiqui, Modern Poetry, educational book house,Ali garh, 1993,page 118

8- Dr.Nusrat choudhri,Faiz ki shayri-aik mutala, sharda printing press,jammu,june 1985,page 67

9- Dr. ibadat brailvi, jaded shayri, educational book house,Ali garh, 1985,page 273

10-Mirza Ashfaq saleem, Zindan or faiz ka nazarya hayat, Mashmoola: she mahi adabyat,Academy Adabyat,Islamabad, January to March,2002,page 199

11-Dr. Saleem Akhtar, Faiz ka tasawer e adab"Meezan" ki roshni ma, Mashmoola: seh mahi adabyat,Academy Adabyat,Islamabad, January to March,2002,page 93

12-Dr. Tabassum kashmeri,La musavi Rashid,book printers, Temple road ,Lahore, 1994,page 27

13-Noon meem Rashid,Halqa arbab e zban o adab k masail, compiled by Mughni tabassum and shaheryar, Rashid fikr o fun, maktaba shair o hikmat,haider abad, 1971,page 381

14- Dr, fakhr ul haq noori, Mutala Rashid ,missal publishers centre,press market, Faisalabad, September 2010, page 159

15-Dr.wazeer agha,nazm e jaded ki karwatain, maktaba meri liberary, Lahore, 1974,page 44

16-Aftab Ahmad,Noon meem Rashid aik mutala, compiled by dr.jameel jalbi,Ahmad brothers, Karachi,1986,page 108